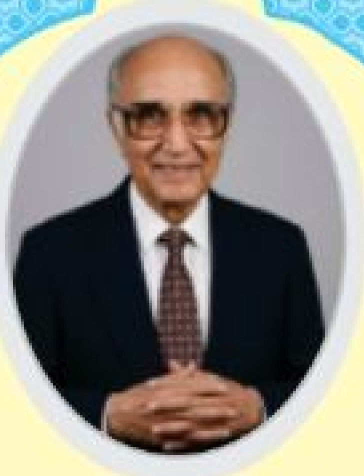

مشتاق احمد یوسفی

(۱۹۲۳ء-۲۰۱۸ء)

مشتاق احمد یوسفی راجستھان کی ایک چھوٹی سی مسلم ریاست "ٹونک" کے ایک تعلیم یافتہ مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے نانا مسلم راٹھور تھے۔ ان کے والد عبدالکریم خان یوسفی نے جے پور شہر میں کاروبار شروع کیا۔ بعدازاں جے پور میونسپل کمیٹی کے چیئرمین اور ریاستی اسمبلی کی حزبِ مخالف کے راہ نما بھی رہے۔ اسمبلی میں سقوطِ حیدر آباد کے بعد پاکستان کی حمایت میں تقریر کرنے پر اُن کو ہجرت کر کے کراچی آنا پڑا۔

یوسفی صاحب نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور عربی، فارسی اور دینیات کے علوم پڑھے۔ انٹرمیڈیٹ راجپوتانہ بورڈ سے درجہ اوّل میں پاس کیا۔ بی۔اے آگرہ یونیورسٹی سے اوّل درجہ میں پاس کیا اور ۱۹۴۵ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم۔اے فلسفہ کی ڈگری بھی درجہ اوّل میں حاصل کی۔ علی گڑھ کے تعلیمی اور تہذیبی اثرات کے زیرِ اثر ان کے جوہر کھلے۔ ۱۹۴۶ء میں راجپوتانہ سول سروس میں شامل ہوئے اور ۱۹۴۹ء تک وہیں رہے۔ پاکستان آنے کے بعد بطور منیجر مسلم کمرشل بنک اپنی ملازمت کا آغاز کیا اور مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے پاکستان بینکنگ کونسل کے چیئرمین کے عہدے تک پہنچے۔

مشتاق احمد یوسفی ایک فطری مزاح نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں اگرچہ سلیقہ مندی، رکھ رکھاؤ اور عبارت کی تزئین و آرائش کا خصوصی اہتمام ملتا ہے، اس کے باوجود ان کے جملے رواں، شگفتہ اور بے ساختہ ہوتے ہیں۔ وہ بات سے بات نکالتے ہیں اور ایسے گہرے اور پوشیدہ معانی پیدا کرتے ہیں کہ وہ کسی مفکر کی بے ساختہ گفت گو کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔ ان کے موضوعات ہماری روزمرہ زندگی اور معمولات سے لیے گئے ہیں لیکن وہ ان میں بھی مزاح کے انوکھے اور چونکا دینے والے گوشے تلاش کر لیتے ہیں۔ ان کے مزاح کی بنیاد ایک اعلیٰ تہذیبی شعور اور مذاقِ سلیم پر استوار ہوتی ہے۔

یوسفی صاحب کا قلم جس موضوع کو چُھوتا ہے اس میں نئی روئیدگی اور بالیدگی پیدا کر دیتا ہے۔ ان کی کوئی ترکیب ایسی نہیں ہوتی جو قاری کو فکر و نظر کی نئی روشنی نہ دے جاتی ہو۔

مشہور مزاح نگار اور شاعر ابنِ انشا نے ان کے متعلق صحیح لکھا ہے کہ اگر مزاحیہ ادب کے موجودہ دور کو ہم کسی نام سے منسوب کر سکتے ہیں تو وہ یوسفی ہی کا نام ہے۔

یوسفی صاحب کے پانچ مجموعے شائع ہوئے: ''چراغ تلے''، ''خاکم بدہن''، ''زرگزشت''، ''آبِ گم''، اور ''شامِ شعرِ یاراں''۔

''خاکم بدہن'' پر انھیں ''آدم جی'' ادبی انعام سے بھی نوازا گیا۔

www.ilmkidunya.com

سبق: ۵

کافی

تدریسی مقاصد:

- ☆ مزاحیہ ادب کی خصوصیات اور اس کی اہمیت کو سمجھنا
- ☆ سبق ''کافی'' کے مرکزی خیال اور بنیادی نکات کو بیان کرنا
- ☆ مشتاق احمد یوسفی کے اسلوبِ نگارش (شوخیِ بیان، ظرافت، برجستگی) کی خصوصیات کی نشان دہی کرنا
- ☆ مزاحیہ تحریر کے ادبی حُسن اور زبان کی چاشنی کو محسوس کرنا

میں نے سوال کیا ''آپ کافی کیوں پیتے ہیں؟''
انھوں نے جواب دیا ''آپ کیوں نہیں پیتے؟''
''مجھے اس میں سگار کی سی بو آتی ہے۔''

''اگر آپ کا اشارہ اس کی سوندھی سوندھی خوشبو کی طرف ہے تو یہ آپ کی قوتِ شامہ کی کوتاہی ہے۔''

گو کہ ان کا اشارہ صریحاً میری ناک کی طرف تھا، تاہم رفعِ شر کی خاطر میں نے کہا: ''تھوڑی دیر کے لیے یہ مان لیتا ہوں کہ کافی میں سے بھینی بھینی مہک آتی ہے مگر یہ کہاں کی منطق ہے کہ جو چیز ناک کو پسند ہو وہ حلق میں انڈیل لی جائے۔ اگر ایسا ہی ہے تو کافی کا عطر کیوں نہ کشید کیا جائے تا کہ ادبی محفلوں میں ایک دوسرے کے لگایا کریں۔''

تڑپ کر بولے: ''صاحب! میں ماکولات میں معقولات کا دخل جائز نہیں سمجھتا، تاوقتیکہ اس گھپلے کی اصل وجہ تلفظ کی مجبوری نہ ہو۔ کافی کی مہک سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک تربیت یافتہ ذوق کی ضرورت ہے۔ یہی سوندھا پن لگی ہوئی کھیر اور دُھنگارے رائتے میں ہوتا ہے۔''

میں نے معذرت کی: ''کھرچن اور دھنگار دونوں سے مجھے متلی ہوتی ہے۔''

فرمایا: ''تعجب ہے! یوپی میں تو شرفا بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔''

''میں نے اسی بنا پر ہندوستان چھوڑا۔''

چراندے ہو کر کہنے لگے: ''آپ قائل ہو جاتے ہیں تو کج بحثی کرنے لگتے ہیں۔''

جواباً عرض کیا: ''گرم ممالک میں بحث کا آغاز صحیح معنوں میں قائل ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ دانستہ دل آزاری ہمارے مشرب میں گناہ

www.ilmkidunya.com

ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ کافی خوش ذائقہ ہوتی ہے تو کسی بچے کو پلا کر اس کی صورت دیکھ لیجیے۔''

جھلا کر بولے: ''آپ معصوم بچوں کو بحث میں کیوں گھسیٹتے ہیں؟''

میں بھی الجھ گیا: ''آپ لوگ ہمیشہ بچوں سے پہلے لفظ معصوم کیوں لگاتے ہیں؟ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ کچھ بچے گنہ گار بھی ہوتے ہیں؟ خیر آپ کو بچوں پر اعتراض ہے تو بلّی کو لیجیے۔''

''بلّی ہی کیوں؟ بکری کیوں نہیں؟'' وہ سچ مچ مچلنے لگے۔

میں نے سمجھایا: ''بلّی اس لیے کہ جہاں تک پینے کی چیزوں کا تعلق ہے، بچے اور بلّیاں بُرے بھلے کی کہیں بہتر تمیز رکھتے ہیں۔''

ارشاد ہوا: ''کل کو آپ کہیں گے کہ چوں کہ بچّوں اور بلیوں کو پکّے گانے پسند نہیں آسکتے اس لیے وہ بھی لغو ہیں۔''

میں نے انھیں یقین دلایا: ''میں ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا۔ پکّے راگ اِنھیں کی ایجاد ہیں۔ آپ نے بچوں کا رونا اور بلیوں کا لڑنا۔۔۔''

بات کاٹ کر بولے: ''بہرحال ثقافتی مسائل کا فیصلہ ہم بچوں اور بلیوں پر نہیں چھوڑ سکتے۔''

آپ کو یقین آئے یا نہ آئے مگر یہ واقعہ ہے کہ جب بھی میں نے کافی کے بارے میں استصوابِ رائے عامہ کیا اس کا انجام اسی قسم کا ہوا۔ شائقین میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اُلٹی جرح کرنے لگتے ہیں۔ اب میں اِسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کافی اور کلاسیکی موسیقی کے بارے میں استفسارِ رائے عامہ کرنا بڑی عاقبت نا اندیشی ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بدمذاقی ہے جیسے کسی نیک مرد کی آمدنی یا خوب صورت عورت کی عمر دریافت کرنا۔ زندگی میں صرف ایک شخص ایسا ملا جو واقعی کافی سے بے زار تھا لیکن اس کی رائے اس لحاظ سے زیادہ قابلِ التفات نہیں کہ وہ ایک مشہور کافی ہاؤس کا مالک نکلا۔

ایک صاحب اپنی پسند کے جواز میں صرف یہ کہہ کر چُپ ہو گئے کہ:

چُھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافی لگی ہوئی (۱)

بعض احباب تو اس سوال سے چراغ پا ہو کر ذاتیات پر اتر آتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ جھوٹے الزام لگاتے ہیں۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ جھوٹے الزام کو سمجھ دار آدمی نہایت اعتماد سے ہنس کر ٹال دیتا ہے مگر سچّے الزام سے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ اس ضمن میں جو متضاد باتیں سننا پڑتی ہیں، ان کی دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔

ایک کرم فرما نے میری بے زاری کو محرومی پر محمول کرتے ہوئے فرمایا:

ہائے کم بخت تُو نے پی ہی نہیں (۲)

۱۔ چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی (شیخ ابراہیم ذوقؔ)

۲۔ میرزا داغؔ دہلوی

ان کی خدمت میں حلفیہ عرض کیا کہ دراصل بیسیوں گیلن کافی پینے کے بعد ہی یہ سوال کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ دوسرے صاحب نے ذرا کھل کر پوچھا کہ کہیں کافی سے چڑ کی اصل وجہ معدے کے وہ داغ (Ulcers) تو نہیں جن کو میں دو سال سے لیے پھر رہا ہوں اور جو کافی کی تیزابیت سے جل اٹھتے ہیں اور اس کے بعد وہ مجھے نہایت تشخیص ناک نظروں سے گھورنے لگے۔

استصوابِ رائے عامہ کا حشر آپ دیکھ چکے۔ اب مجھے اپنے تاثرات پیش کرنے کی اجازت دیجیے۔ میرا ایمان ہے کہ قدرت کے کارخانے میں کوئی شے بے کار نہیں۔ انسان غور و فکر کی عادت ڈالے (یا محض عادت ہی ڈال لے) تو ہر بُری چیز میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور نکل آتی ہے۔ مثال کے طور پر حُقّے ہی کو لیجیے۔ معتبر بزرگوں سے سنا ہے کہ حُقّہ پینے سے تفکّرات پاس نہیں پھٹکتے۔ بلکہ میں تو یہ عرض کروں گا کہ اگر تمبا کو خراب ہو تو تفکرات ہی پر کیا موقوف ہے، کوئی بھی پاس نہیں پھٹکتا۔ اب دیگر ملکی اشیائے خورونوش پر نظر ڈالیے۔ مرچیں کھانے کا ایک آسانی سے سمجھ میں آنے والا فائدہ یہ ہے کہ ان سے ہمارے مشرقی کھانوں کا اصل رنگ اور مزہ دب جاتا ہے۔ خمیرہ گاؤزبان اس لیے کھاتے ہیں کہ بغیر راشن کارڈ کے شکر حاصل کرنے کا یہی ایک جائز طریقہ ہے۔ جوشاندہ اس لیے گوارا ہے کہ اس سے نہ صرف ایک ملکی صنعت کو فروغ ہوتا ہے بلکہ نفسِ امارہ کو مارنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ شلغم اس لیے زہر مار کرتے ہیں کہ ان میں وٹامن ہوتا ہے لیکن جدید طبّی ریسرچ نے ثابت کر دیا ہے کہ کافی میں سوائے کافی کے کچھ نہیں ہوتا۔ اہلِ ذوق کے نزدیک یہی اس کی خوبی ہے۔

معلوم نہیں کافی کیوں، کب اور کس مردم آزار نے دریافت کی لیکن یہ وثوق کے ساتھ کہ سکتا ہوں کہ یونانیوں کو اس کا علم نہیں تھا۔ اگر انھیں ذرا بھی علم ہوتا تو چرائتہ کی طرح یہ بھی یونانی طب کی جزوِ اعظم ہوتی۔ اس قیاس کو اس امر سے مزید تقویت ہوتی ہے کہ قصبوں میں کافی کی بڑھتی ہوئی کھپت کی غالباً ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عطائیوں نے "اللہ شافی، اللہ کافی" کہ کر موخرالذکر کا سفوف اپنے نسخوں میں لکھنا شروع کر دیا ہے۔ زمانۂ قدیم میں اس قسم کی جڑی بوٹیوں کا استعمال عداوت اور عقدِ ثانی کے لیے مخصوص تھا۔ چوں کہ آج کل ان دونوں باتوں کو معیوب خیال کیا جاتا ہے، اس لیے صرف اظہارِ خلوصِ باہمی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

سنا ہے کہ چائے کے بڑے خوب صورت باغ ہوتے ہیں۔ یہ بات یوں بھی سچ معلوم ہوتی ہے کہ چائے اگر کھیتوں میں پیدا ہوتی تو ایشیائی ممالک میں اتنی افراط سے نہیں ملتی بلکہ غلّہ کی طرح غیر ممالک سے درآمد کی جاتی۔ میری معلوماتِ عامہ محدود ہیں مگر قیاس یہی کہتا ہے کہ کافی بھی زمین ہی سے اگتی ہوگی کیوں کہ اِس کا شمار اُن نعمتوں میں نہیں جو اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں پر آسمان سے براہِ راست نازل کرتا ہے۔ تاہم میری چشمِ تخیّل کو کسی طور یہ باور نہیں آتا کہ کافی باغوں کی پیداوار ہو سکتی ہے اور اگر کسی ملک کے باغوں میں یہ چیز پیدا ہوتی ہے تو اللہ جانے وہاں کے جنگلوں میں کیا اُگتا ہوگا؟ ایسے اربابِ ذوق کی کمی نہیں جنھیں کافی اس وجہ سے عزیز ہے کہ یہ ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوتی۔ مجھ سے پوچھیے تو مجھے اپنا ملک اس لیے اور بھی عزیز ہے کہ یہاں کافی پیدا نہیں ہوتی۔

کافی پی پی کر سماج کو کوسنے والے ایک انٹلکچویل نے مجھے بتایا کہ کافی سے دل کا کنول کھل جاتا ہے اور آدمی چہکنے لگتا ہے۔ میں بھی اس رائے سے متفق ہوں۔ کوئی معقول آدمی یہ سیال پی کر اپنا منھ بند نہیں رکھ سکتا۔ ان کا یہ دعویٰ بھی غلط نہیں معلوم ہوتا کہ کافی پینے سے بدن میں چُستی آتی ہے۔ جبھی تو لوگ دوڑ دوڑ کر کافی ہاؤس جاتے ہیں اور گھنٹوں وہیں بیٹھے رہتے ہیں۔

بہت دیر تک وہ یہ سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ کافی نہایت مفرّح ہے اور دماغ کو روشن کرتی ہے۔ اس کے ثبوت میں انھوں نے اپنی مثال دی کہ ''ابھی کل کا واقعہ ہے۔ میں دفتر سے گھر نڈھال پہنچا۔ بیگم بڑی مزاج داں ہیں۔ فوراً کافی کا "Tea Pot" لاکر سامنے رکھ دیا۔''

میں ذرا چکرایا ''پھر کیا ہوا؟'' میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''میں نے دودھ دان میں سے کریم نکالی'' انھوں نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا ''شکر دان میں سے کیا نکلا؟''

فرمایا ''شکر نکلی اور کیا ہاتھی گھوڑے نکلتے؟''

مجھے غصّہ تو بہت آیا مگر کافی کا سا گھونٹ پی کر رہ گیا۔

عمدہ کافی بنانا بھی کیمیا گری سے کم نہیں۔ یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ دونوں کے متعلق ہی سننے میں آیا ہے کہ بس ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔ ہر ایک کافی ہاؤس اور خاندان کا ایک مخصوص نسخہ ہوتا ہے جو سینہ بہ سینہ، حلق بہ حلق منتقل ہوتا رہتا ہے۔ مشرقی افریقہ کے اس انگریز افسر کا نسخہ تو سبھی کو معلوم ہے جس کی مزے دار کافی کی سارے ضلع میں دھوم تھی۔ ایک دن اس نے ایک نہایت پُرتکلف دعوت کی جس میں اس کے حبشی خانساماں نے بہت ہی خوش ذائقہ کافی بنائی۔ انگریز نے بہ نظرِ حوصلہ افزائی اس کو معزز مہمانوں کے سامنے طلب کیا اور کافی بنانے کی ترکیب پوچھی۔

حبشی نے جواب دیا: ''بہت ہی سہل طریقہ ہے۔ میں بہت سا کھولتا ہوا پانی اور دودھ لیتا ہوں۔ پھر اس میں کافی ملا کر دم کرتا ہوں۔''

''لیکن اسے حل کیسے کرتے ہو؟ بہت مہین چھنی ہوتی ہے۔''

''حضور کے موزے میں چھانتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟ کیا تم میرے قیمتی موزے استعمال کرتے ہو؟'' آقا نے غضب ناک ہوکر پوچھا۔

خانساماں سہم گیا: ''نہیں سرکار! میں آپ کے صاف موزے کبھی استعمال نہیں کرتا۔''

سچ عرض کرتا ہوں کہ میں کافی کی تُندی اور تلخی سے ذرا نہیں گھبراتا۔ بچپن ہی سے یونانی دواؤں کا عادی رہا ہوں اور قوتِ برداشت اتنی بڑھ گئی ہے کہ کڑوی سے کڑوی

گولیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا (۱)

لیکن کڑواہٹ اور مٹھاس کی آمیزش سے جو معتدل قوام بنتا ہے وہ میری برداشت سے باہر ہے۔ میری انتہا پسند طبیعت اس میٹھے زہر کی تاب نہیں لا سکتی۔ لیکن دِقّت یہ آن پڑتی ہے کہ میں میزبان کے اصرار کو عداوت اور وہ میرے انکار کو تکلّف پر محمول کرتے ہیں۔ لہٰذا جب وہ میرے کپ میں شکر ڈالتے وقت اخلاقاً پوچھتے ہیں:

۱۔ گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا (مرزا غالب)

’’ایک چمچہ یا دو؟‘‘

تو مجبوراً یہی گزارش کرتا ہوں کہ ’’میرے لیے شکردان میں کافی کے دو چمچے ڈال دیجیے۔‘‘

صاف ہی کیوں نہ کہ دوں کہ جہاں تک اشیائے خورونوش کا تعلق ہے، میں تہذیبِ حواس کا قائل نہیں۔ میں یہ فوری فیصلہ ذہن کے بجائے زبان پر چھوڑنا پسند کرتا ہوں۔ پہلی نظر میں جو محبت ہو جاتی ہے اس میں بالعموم نیّت کا فتور کارفرما ہوتا ہے لیکن کھانے پینے کے معاملے میں میرا یہ نظریہ ہے کہ پہلا ہی لقمہ یا گھونٹ فیصلہ کُن ہوتا ہے۔ بدذائقہ کھانے کی عادت کو ذوق میں تبدیل کرنے کے لیے بڑا پتّا مارنا پڑتا ہے مگر میں اس سلسلے میں برسوں تلخیِ کام و دہن گوارا کرنے کا حامی نہیں، تاوقتیکہ اس میں بیوی کا اصرار یا گرہستی مجبوریاں شامل نہ ہوں۔ بنابریں مَیں ہر کافی پینے والے کو جنتی سمجھتا ہوں، میرا عقیدہ ہے کہ جو لوگ عمر بھر ہنسی خوشی یہ عذاب جھیلتے رہے، ان پر دوزخ اور حمیم حرام ہیں۔

کافی امریکا کا قومی مشروب ہے۔ میں اس بحث میں نہیں اُلجھنا چاہتا کہ امریکی کلچر کافی کے زور سے پھیلا یا کافی کلچر کے زور سے رائج ہوئی۔ یہ بعینہٖ ایسا سوال ہے جیسے کوئی بے ادب یہ پوچھ بیٹھے کہ ’’غبارِ خاطر‘‘(۱) چائے کی وجہ سے مقبول ہوئی یا چائے ’’غبارِ خاطر‘‘ کے باعث؟ ایک صاحب نے مجھے لاجواب کرنے کی خاطر یہ دلیل پیش کی، امریکا میں تو کافی اس قدر عام ہے کہ جیل میں بھی پلائی جاتی ہے۔ عرض کیا کہ جب خود قیدی اس پر احتجاج نہیں کرتے تو ہمیں کیا پڑی کہ وکالت کریں۔ پاکستانی جیلوں میں بھی قیدیوں کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا جائے تو انسدادِ جرائم میں کافی مدد ملے گی۔ پھر انھوں نے بتایا کہ وہاں لاعلاج مریضوں کو بشاش رکھنے کی غرض سے کافی پلائی جاتی ہے۔ کافی کے سریع التاثیر ہونے میں کیا کلام ہے۔ میرا خیال ہے کہ دمِ نزع حلق میں پانی چوانے کے بجائے کافی کے دو چار قطرے ٹپکا دیے جائیں تو مریض کا دم آسانی سے نکل جائے۔ بخدا، مجھے تو اس تجویز پر بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ گناہ گاروں کی فاتحہ کافی پر دلائی جائے۔

آپ کے ذہن میں خدانخواستہ یہ شبہ نہ پیدا ہو گیا ہو کہ راقم السطور کافی کے مقابلے میں چائے کا طرف دار ہے تو مضمون ختم کرنے سے پہلے اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں کافی سے اس لیے بے زار نہیں ہوں کہ مجھے چائے عزیز ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کافی کا جلا چائے پھونک کر پیتا ہے۔

ع ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس!
ایک وہ ہیں کہ جنھیں ’’چائے‘‘ کے ارماں ہوں گے(۲)

(چراغ تلے)

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے مجموعۂ مکاتیب کا نام

۲۔ ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہوں گے (مومن خان مومنؔ)

مشق

۱۔ مختصر جواب دیں۔

(الف) مصنّف کافی کو کیوں ناپسند کرتے تھے؟

(ب) کافی پینے والے انٹلیکچوئل کی کافی کے متعلق کیا رائے ہے؟

(ج) کافی ہاؤس کی شام کا منظر اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

(د) کافی کے بارے استصوابِ رائے کا کیا نتیجہ نکلا؟

(ہ) مصنف نے جوشاندہ گوارا ہونے کے کیا اسباب بتائے؟

(و) عمدہ کافی بنانے کو کیمیا گری کیوں کہا گیا ہے؟

۲۔ درست جواب کی نشان دہی کریں:

(i) مصنّف کو کافی میں بُو آتی ہے:

(الف) نسوار کی (ب) چائے کی (ج) سگریٹ کی (د) سِگار کی

(ii) معتبر بزرگوں سے سنا ہے کہ حُقّہ پینے سے پاس نہیں بھٹکتے:

(الف) آلام (ب) تخیّلات (ج) تفکّرات (د) غم

(iii) شلغم میں ہوتا ہے:

(الف) وٹامن (ب) نکوٹین (ج) کیلشیم (د) آئرن

(iv) کافی قومی مشروب ہے:

(الف) آسٹریلیا کا (ب) امریکا کا (ج) کینیا کا (د) برطانیہ کا

(v) کافی کا جلا چائے بھی پیتا ہے:

(الف) ٹھنڈی کر کے (ب) سونگھ سونگھ کر (ج) پھونک پھونک کر (د) انتہائی گرم

۳۔ سبق ''کافی''، کو مدِنظر رکھتے ہوئے درج ذیل جملوں کی وضاحت کریں:

(الف) گرم ممالک میں بحث کا آغاز صحیح معنوں میں قائل ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے۔

(ب) صاحب! مَیں ماکولات میں معقولات کا دخل جائز نہیں سمجھتا۔

(ج) کافی پی پی کر سماج کو کوسنے والے ایک انٹلیکچوئل نے مجھے بتایا کہ کافی سے دل کا کنول کھل جاتا ہے اور آدمی چہکنے لگتا ہے۔

www.ilmkidunya.com

(د) امریکی کلچر کافی کے زور سے پھیلا یا کافی کلچر کے زور سے رائج ہوئی۔

(ہ) میں کافی سے اس لیے بیزار نہیں ہوں کہ مجھے چائے عزیز ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کافی کا جلا چائے بھی پھونک کر پیتا ہے۔

۴۔ سبق ''کافی'' کے متن سے کسی ایک پیراگراف کی تلخیص کریں اور عنوان بھی تجویز کریں۔

۵۔ سبق ''کافی'' پڑھ کر مصنف کا نقطۂ نظر رکھتے ہوئے خلاصہ تحریر کریں۔

۶۔ سیاق وسباق کے حوالے سے درج ذیل اقتباسات کی تشریح کریں:

(الف) ''تھوڑی دیر کے لیے یہ مان لیتا ہوں ۔۔۔۔۔۔رائج میں ہوتا ہے۔''

(ب) ''وہ جب بھی میں کافی کے بارے ۔۔۔۔۔۔۔کافی ہاؤس کا مالک نکلا۔''

علاماتِ اوقاف

اوقاف، وقف کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ''رکنا''۔ اس طرح علامتِ اوقاف کے لفظی معنی ہیں ''رکنے کی علامتیں''، یعنی ایسی علامتیں جو تحریر میں ایک جملے کو دوسرے جملے یا کسی لفظ یا حرف کو کسی دوسرے لفظ یا حرف سے الگ کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ انگریزی میں ان علاماتِ اوقاف کو ''Punctuation'' کہتے ہیں۔ اگر یہ علامتیں نہ ہوں تو عبارت کا مفہوم سمجھنے میں بہت دشواری پیش آئے۔ علاماتِ اوقاف کی تفصیل درج ذیل ہے:

www.ilmkidunya.com

ختمہ (وقفِ مطلق)	۔	یہ چھوٹا سا خط جملے کے اختتام پر لگایا جاتا ہے۔ مخففات کے بعد بھی یہ علامت لگائی جاتی ہے مثلاً: ن۔م۔راشد۔
سکتہ (وقفِ خفیف)	،	یہ علامت سب سے چھوٹے رکم وقفے کو ظاہر کرتی ہے جو عبارت میں مختصر ٹھہراؤ کے لیے لگائی جاتی ہے۔ مثلاً: آم، خوبانی، انار اور سیب ذائقہ دار پھل ہیں۔
وقفہ (نصف وقف)	؛	یہ علامت جملے میں سکتہ سے زیادہ ٹھہراؤ کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ ایک جملے کے مختلف ذیلی حصوں کو جوڑنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ نیز کسی جملے میں مختلف الفاظ کی دو یا دو سے زائد تراکیب کے درمیان وقفہ کی علامت استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ۱۔ عالیہ اور عظمیٰ؛ طاہرہ اور زاہدہ؛ تسنیم اور ناز الگ الگ ٹولیوں میں بیٹھی ہیں۔ ۲۔ لاہور پنجاب کا؛ کراچی سندھ کا؛ پشاور خیبر پختونخوا کا اور کوئٹہ بلوچستان کا دارالحکومت ہے۔
رابطہ (وقفِ لازم)	:	یہ علامت جملے میں وقفہ سے زیادہ ٹھہراؤ کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ کسی کا قول، فرمان، مکالمہ، حوالہ کہاوت یا ضرب المثل نقل کرنے سے پہلے اور جملے کے الگ حصوں میں ربط پیدا کرنے کے لیے بنیادی جملے کے بعد اس کے ذیلی حصوں سے پہلے رابطہ کی علامت استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً: قائدِ اعظم نے فرمایا: ''کام، کام اور بس کام۔'' کسی نے سچ کہا ہے: ''گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔''

تفصیلیہ	:-	یہ علامت کسی بات کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے لگائی جاتی ہے۔مثلاً:علم کے درج ذیل فائدے ہیں:۔
استفہامیہ (سوالیہ)	؟	یہ علامت ہر طرح کے سوال کے آخر میں لگائی جاتی ہے۔مثلاً:تم کیا کر رہے ہو؟
واوین	" "	یہ علامت کسی قول یا اقتباس کے شروع اور آخر میں لگاتے ہیں۔مثلاً: قائدِ اعظم کا قول ہے:"ایمان، اتحاد، تنظیم"
قوسین	()	یہ علامت عبارت میں کسی بات کو دوسرے جملوں سے الگ کرنے کے لیے لگاتے ہیں۔مثلاً: ڈاکٹر عبدالقدیر خاں (اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے) عظیم سائنس دان تھے۔جملۂ معترضہ کو قوسین میں لکھتے ہیں۔
ندائیہ/فجائیہ/استعجابیہ	!	فجائیہ کی علامت خوف، محبت، حیرت، نفرت، خوشی، غم وغیرہ جیسے جذبات کے بے ساختہ اظہار کے لیے استعمال ہوتی ہے۔مثلاً: واہ! کتنا حسین منظر ہے۔حروفِ تخاطب کے بعد یہ علامت استعمال ہو تو ندائیہ کہلاتی ہے۔مثلاً: جنابِ عالی!، السلام علیکم!، احمد! میری بات سنو۔
خطِ فاصل (ترچھا خط)	/	تحریر میں متبادل اسما، افعال اور بیانات کے درمیان خطِ فاصل کا استعمال کیا جاتا ہے اور عدالتی مراسلہ جات میں مختلف سیریل نمبروں کے درمیان اس علامت کا استعمال کیا جاتا ہے۔مثلاً: (الف) میں/ہم اقرار کرتا/کرتے ہیں۔ (ب) بن/بنت وغیرہ۔

۷۔ ہر علامتِ وقف کو استعمال کرتے ہوئے ایک ایک جملہ تحریر کریں۔

۸۔ سبق "کافی" پڑھ کر اس میں استعمال ہونے والی مختلف علامات اوقاف کی فہرست تیار کریں اور انھیں اپنے جملوں میں استعمال کریں۔

۹۔ اپنی پسند کے مطابق چائے/کافی میں سے کسی ایک مشروب کی آپ بیتی تحریر کریں۔

سرگرمیاں برائے طلبہ:

☆ طلبہ اپنی جماعت میں "اردو ذریعۂ اظہار" کے موضوع پر مباحثے کا اہتمام کریں اور اس کے حق یا مخالفت میں دلائل پیش کریں۔

☆ طلبہ انٹرنیٹ، مستند معلوماتی کتب یا انسائیکلوپیڈیا کی مدد سے اردو زبان کے نثری ادب کی ہر صنف سے متعلق تین تین ادیبوں کی خدمات کے بارے میں معلومات حاصل کر کے تحقیقی رپورٹ تیار کریں اور جماعت میں پیش کریں۔

برائے اساتذہ کرام:

☆ مشتاق احمد یوسفی کی شخصیت، ان کی ظرافت نگاری اور اُردو ادب میں ان کا مقام بیان کریں۔

☆ اساتذہ پہلے مناسب اتار چڑھاؤ اور زیر و بم کے ساتھ عبارت کی قرأت کریں پھر طلبہ سے باری باری سبق پڑھوایا جائے۔

☆ پُر مزاح جملوں اور طنزیہ انداز کی نشان دہی کرائی جائے۔

☆ طلبہ سے گفت گو کرائی جائے کہ مصنف نے مزاح کے پردے میں کن معاشرتی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

www.ilmkidunya.com